Mah Para Safdar's Autobiography: An Exposition of Patriotism

ماہ پارہ صفدر کی آپ بیتی: فکرِ وطن کا اظہاریہ

Farmina Sher*[1]
PhD Scholar, Department Of Urdu, Lahore College For Women University, Lahore
Dr.Naila Anjum*[2]
Assistant Professor, Department Of Urdu, Lahore College For Women University, Lahore

فرینہ شیر☆[1]
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر نائلہ انجم☆[2]
،اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

Correspondance: sher@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 07-08-2025
Accepted:27-09-2025
Online:29-09-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: This paper explores the personal and professional journey of Mahpara Safdar, a distinguished Pakistani broadcaster, whose autobiography "Mera Zamana Meri Kahani" reflects not only her individual experiences but also the sociopolitical landscape of Pakistan. Through her narrative, she highlights critical issues such as class disparity, lack of basic amenities, poor governance, and a failing educational system. Her autobiography also reveals a deep sense of worry and concern for the future of Pakistan, as she constantly reflects on its challenges and lost potential. Her comparisons between the UK and Pakistan expose the deep- rooted structural inequalities and administrative failures in her homeland. Despite her migration to the UK and professional success with the BBC, Mahpara's emotional connection to Pakistan remains powerful and unwavering. It also underscores how Western societies have adopted and implemented Islamic principles more justly than Muslim nation themselves. In this article, we will highlight Mahpar's ideology of patriotism..

KEYWORDS:Auto-biographical narrative, Socio-political critique, Class disparity,

ماہ پارہ صفدر، جن کا اصل نام ماہ پارہ زیدی ہے، لاہور میں پیدا ہوئیں مگر ان کی پرورش خوشاب اور سرگودھا میں ہوئی۔ اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرگودھا کے گورنمنٹ کالج سے گریجویشن کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کیا، جہاں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیمی میدان سے نشریاتی سفر کا آغاز ۱۹۷۴ء میں ریڈیو پاکستان لاہور کے ایک یونیورسٹی پروگرام سے ہوا اور رفتہ رفتہ ان کی آواز مختلف ریڈیو پروگراموں کا حصہ بنتی گئی۔ انھوں نے لاہور ٹیلی وژن کے شعبہ خبر نامہ میں قدم رکھا جیسا کہ معروف ادبی شخصیت رضا علی عابدی کہتے ہیں:

> "بعض افراد کو قدرت خود منتخب کرتی ہے اور ان سے کام لیتی ہے۔ ماہ پارہ صفدر بھی شاید انھی میں سے ایک تھیں۔"(۱)

1977ء میں انھوں نے پاکستان ٹیلی وژن کے لیے خبرنامہ پڑھنا شروع کیا جس سے انھیں قومی سطح پر ایک معتبر شناخت ملی۔ ۱۹۸۰ء میں وہ اسلام آباد منتقل ہوئیں جہاں ریڈیو پاکستان کے قومی شعبہ خبر سے وابستہ ہوئیں۔ اسی عرصے میں انھوں نے قومی ورثہ کے ادارے میں ریسرچ ٹیم کے ساتھ کام کرتے ہوئے پاکستان کے شمالی علاقوں کے تحقیقی دورے کیے، جو ان کے لیے ایک انوکھا تجربہ ثابت ہوا۔ ۱۹۷۹ء میں ان کی شادی ریڈیو پاکستان لاہور کے معروف پروڈیوسر صفدر ہمدانی سے ہوئی جو قیامِ پاکستان کی خبر نشر کرنے والے تاریخی نشریاتی شخصیت مصطفیٰ علی ہمدانی کے صاحبزادے ہیں۔ شادی کے بعد وہ ماہ پارہ زیدی سے ماہ پارہ صفدر ہو گئیں۔ ۱۹۹۰ء میں انھوں نے بی بی سی اردو سروس لندن میں شمولیت اختیار کی اور اپنے دو کم سن بچوں کے ہمراہ برطانیہ منتقل ہو گئیں۔ وہاں تقریباً ۲۵ برس تک مستقل و جز وقتی طور پر بی بی سی اردو سروس سے منسلک رہیں۔ وہ نہ صرف حالات حاضرہ کے پروگراموں کی مدیر و پیش کار رہیں بلکہ ویب سائٹ کے لیے بطور شفٹ ایڈیٹر بھی کام کیا۔ برطانیہ میں مقیم مشرقی خواتین پر سیریز بنانے کے لیے انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا جبکہ بلوچستان کے مختلف شہروں میں جا کر وہاں کے سماجی و سیاسی مسائل پر پروگرام تیار کیے۔ ان کا صحافتی انداز حقیقت پر مبنی اور مشاہدے سے لبریز ہوتا تھا، جس کا اعتراف بی بی سی اردو سروس نے تعریفی اسناد دے کر کیا۔

انھیں یورپی یونین کانفرنس (ڈبلن) کے علاوہ ایران کے صدارتی انتخابات، اور شام، مصر اور عراق جیسے ممالک میں جا کر رپورٹنگ کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے نہ صرف نو منتخب ایرانی صدر احمدی نژاد کی نیوز کانفرنس کی رپورٹنگ کی بلکہ تہران یونیورسٹی کے طلبا سے انٹرویوز پر مبنی پروگرامز بھی تیار کیے۔ اپنے طویل صحافتی سفر کے دوران ماہ پارہ صفدر کو کئی اعزازات سے نوازا گیا جن میں ۱۹۸۵ء میں پی ٹی وی کی جانب سے بہترین نیوز کاسٹر کا ایوارڈ شامل

ہے۔ تعلیم کے میدان میں بھی ان کی جستجو جاری رہی۔ لندن میں رہتے ہوئے، چھوٹے بچوں اور جز وقتی ملازمت کے باوجود انھوں نے لندن یونیورسٹی سے "مطالعہ خواتین" میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی، جسے وہ اپنی علمی زندگی کا سنگ میل قرار دیتی ہیں۔

"میرا زمانہ میری کہانی" بلاشبہ ہم سب کا زمانہ اور ہم سب کی کہانی ہے۔ ماہ پارہ صفدر کی کتاب محض ایک خود نوشت نہیں بلکہ ایک جامع فکری اور تجرباتی دستاویز ہے جو بے شمار پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اگر اس کے موضوعات پر ایک سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر باب اور ہر عنوان ان کی زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ انھوں نے مصنوعی انداز اپنانے یا لفظوں کا الجھاؤ پیدا کرنے کے بجائے سادگی، سچائی اور خلوص کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔

چار سو ساٹھ سے زائد صفحات اور تین بھرپور ابواب پر مشتمل اس کتاب میں کل ترانوے موضوعات شامل ہیں، جن کو مکمل کرنے میں انھیں تقریباً دو برس لگے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے تحریر کے دوران پہلے سے تیار شدہ نوٹس پر انحصار کرنے کے بجائے، اپنی یادداشت، صوتی، قلمی اور بصری ذخائر سے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عنوان کی تمام جہتوں کو انصاف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔یقیناً جب کبھی کوئی مورخ پاکستان کی سیاسی، سماجی، لسانی، اقتصادی یا نشریاتی تاریخ پر قلم اٹھائے گا، تو ماہ پارہ صفدر کی یہ کتاب اس کے لیے ایک قابلِ اعتماد اور ناگزیر ماخذ کے طور پر سامنے آئے گی۔

وطن سے دور رہنے والے لوگ اکثر محسوس کرتے ہیں کہ اصل پہچان، محبت، اور سکون صرف اپنی مٹی میں ہے۔ پردیس کی رنگینیاں، سہولیات اور آسائشیں وقتی ہو سکتی ہیں، لیکن دل کی گہرائیوں میں بسنے والی وطن کی یادیں ہر لمحہ ایک خلا سا پیدا کرتی ہیں۔ جب اذان کی آواز کسی اور زبان میں سنائی دے، جب تہوار اپنوں کے بغیر گزرے، جب زبان کو سمجھنے والے چہرے کم ہوں، تو تب دل بے اختیار اپنی سرزمین کی جانب کھنچتا ہے۔ وطن صرف ایک جغرافیائی حدود کا نام نہیں بلکہ وہ جذباتی رشتہ ہے جو ہماری شناخت، ہمارے لہجے، ہمارے بچپن، اور ہمارے خوابوں سے جڑا ہوتا ہے۔ ماہ پارہ جیسی شخصیات، جو پردیس میں رہ کر بھی اپنی زبان، اپنے ادب، اور اپنی تہذیب سے جُڑی رہتی ہیں، اس سچ کی گواہ ہیں کہ وطن کی محبت انسان کی رگ رگ میں ہوتی ہے۔ سر سید احمد خان جیسے محب وطن جب وطن کا ذکر کرتے تھے تو ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، کیونکہ سچے دل سے وطن کی قدر وہی جانتا ہے جو اس سے دور ہو۔ پردیس میں رہ کر وطن کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور یہ احساس انسان کو اپنے ورثے، اپنی زبان اور اپنی قوم کے لیے کچھ کرنے پر اُبھارتا ہے۔ ماہ پارہ صفدر کی یادیں ہمیشہ وطن سے وابستہ رہیں۔ وزیر اعظم نواز شریف کے دورے پر اس بات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

> "وزیر اعظم نواز شریف برطانیہ کے دورے میں اپنی اہلیہ، مریم بی بی اور
> اپنے وفد کے ہمراہ وسطی لندن کے ایک پر تعیش ہوٹل ڈور چیسٹر میں
> ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں بی بی سی اردو سروس کے لیے بیگم کلثوم نواز کا

انٹرویو کرنے پہنچی تو میاں صاحب کہیں جا رہے تھے، وفد کے کئی لوگ اُن کے ہمراہ تھے مگر وہ رکے اور مجھ سے حال چال دریافت کر کے پوچھنے لگے کہ آپ یہاں خوش ہیں؟ تو میں نے جواب دیا کہ خوش تو ہوں مگر اپنا وطن بہت یاد آتا ہے۔ تو وہ مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر آگے بڑھ گے کہ تو پھر واپس آجایئے۔"(۲)

ماہ پارہ صرف تین برس کے پیشہ ورانہ معاہدے پر بی بی سی کی عالمی سروس کے ساتھ بیرونِ ملک آئیں تھیں۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تین برس تیس برس میں بدل گئے۔ ماہ پارہ کا ہر برس، ہر موسم، ہر لمحہ وطن سے، اس کی مٹی سے، اس کی گلیوں سے ایک نئی یاد، ایک نئی سوچ اور ایک نیا فاصلہ لے آیا۔ ان کا شمار اُن افراد میں ہوتا ہے جنھوں نے مستقل بنیادوں پر وطن چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا مگر حالات اور حقیقتوں نے انھیں پلٹنے نہ دیا۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ جب کوئی انسان وطن چھوڑتا ہے تو وہ یہ سوچ کر ہرگز نہیں نکلتا کہ ہمیشہ کے لیے ترکِ وطن کرے گا۔ تعلیم، روزگار یا پیشہ ورانہ ذمہ داریاں وقتی سفر کی بنیاد بنتی ہیں مگر وقت ایسا بازی گر ہے جو ان وقتی فیصلوں کو مستقل زندگی کا روپ دے دیتا ہے۔

اکثر پاکستانی سرکاری یا سفارتی خدمات کے لیے بیرون ملک جاتے ہیں اور وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض نے یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے لیے مقامی خواتین سے شادیاں کر لیتے ہیں۔ چاہے وہ رشتے کامیاب رہے یا نہ رہے لیکن ان کے لیے یہاں رہنے کا جواز بن جاتا ہے۔ وہ اکثر حیران ہوتیں کہ بعض افراد جو دیارِ غیر کو "دار الکفر" کہنے میں بھی جھجک محسوس نہ کرتے، وہ بھی واپسی سے گریزاں تھے۔ اس ضمن میں مصنفہ کہتی ہیں:

"میں پاکستان کے سفارتی عملے کے بھی کئی لوگوں کو جانتی ہوں جو اپنے ملکوں میں اقربا پروری اور میرٹ کے بجائے سفارشی نظام سے نالاں تھے۔ برطانیہ سے واپس نہیں جانا چاہتے تھے، سفارت خانے میں قیام کی مدت ختم ہونے کے بعد کسی نہ کسی صورت یہاں بسنا چاہتے تھے۔ کئی لڑکے یہاں رہنے کے لیے مقامی لڑکیوں سے شادیاں کر لیتے ہیں۔ وہ زیادہ نہیں چلتیں، چھوٹ چھٹاؤ ہو جاتا ہے مگر یہاں رہنے کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی یہاں سے جانے کو تیار نہیں جو اسے دار الکفر کہتے ہیں۔"(۳)

یہ رویہ صرف مفاد پرستی نہیں، ایک نظام، ایک ذہنی و جذباتی تھکن کا اظہار بھی تھا۔ وطن سے محبت اپنی جگہ مگر اس محبت کو نبھانے کے لیے جو قربانیاں درکار ہیں، وہ شاید اب کسی کے بس میں نہیں۔ اپنے قیام کے ابتدائی دنوں وہ سوال جو دوسروں کے ذہن میں ابھرتے کہ ان کے پاس شاید وطن میں کوئی سہولت، روزگار یا عزت نہیں رہی ہو گی، اسی لیے واپسی ممکن نہیں ہو سکی مگر گزرتے وقت کے ساتھ، وہ خود انہی سوالوں کا حصہ بن گئیں۔ آج وہی

سوالات ان کی اپنی ذات کا عکس بن چکے ہیں۔ ان کا مشاہدہ گواہ ہے کہ پردیس میں زندگی صرف ترقی کا نام نہیں، یہ ایک مسلسل اندرونی تقسیم کا تجربہ بھی ہے۔ یہاں رہنے والا ہر شخص دو وجودوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک وجود جو باہر کی دنیا کے ساتھ چلنا سیکھ چکا ہے اور دوسرا جو ہر روز وطن کے خواب میں بھیگتا ہے۔ بقول ماہ پارہ صفدر:

> ''یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے اور خود میرے پروفیشن میں لوگ ستر اور اسّی کے عشرے میں اپنی معاہدہ کی مدت پوری کرنے کے بعد ہنسی خوشی واپس ہوتے تھے۔ اپنے قیام کے ابتدائی مہینوں میں کئی کئی عشروں سے برطانیہ میں مقیم لوگوں پر میں دل ہی دل میں بڑا ترس کھاتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ ان کے پاس پاکستان میں کوئی اچھا روزگار وغیرہ نہیں ہو گا اسی لیے یہاں سے واپس نہیں گئے۔ کیونکہ میں جب آ رہی تھی تو سب لوگ یہ پوچھتے تھے کہ 'آپ جیسے لوگوں کو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟' میں اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے شرطیں لگاتی تھی اور بہت فخر یہ کہتی تھی میری تو پاکستان میں بہت اچھی ملازمت ہے، مجھے یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو تین برس بعد واپس چلی جاؤں گی۔ مگر جو لوگ مجھ سے پہلے اس جزیرے پر اتر چکے تھے، جانتے تھے کہ اس جزیرے کی جانب آنے والے راستوں میں واپسی کا موڑ گم ہو جاتا ہے۔''(۴)

ماہ پارہ کو اپنے وطن سے دلی وابستگی ہے۔ انھیں پاکستان کو چھوڑنے کا بہت دکھ ہے۔ برطانیہ میں مقیم ہونے کے باوجود بھی پاکستان کو بہت یاد کرتی ہیں۔ مصنفہ وطن واپس کیوں نہ آ سکیں؟ اس کے پیچھے بہت سی بنیادی وجوہات ہیں جنھوں نے انھیں واپس آنے سے روکے رکھا۔ مگر ایک سچ جس سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں۔ وطن سے محبت کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ اس کی خامیوں سے نظریں چرا لی جائیں۔ پاکستان جس سے ان کی ہر سانس جڑی ہے، آج کرپشن، مہنگائی، بدعنوانی، تعلیم کی پستی، صحت کی سہولتوں کی کمی اور بیروزگاری جیسے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ ہر ادارہ زوال پذیر ہے، ہر طبقہ بے چینی کا شکار ہے۔ یہ وہ سچ ہے جسے محبت کی آنکھ سے دیکھنا ہی اصل حب الوطنی ہے۔

ماہ پارہ کی آپ بیتی میں جو بات سب سے نمایاں ہوتی ہے، وہ ہے وطن کی یاد اور اس سے جڑی ہر چھوٹی بڑی چیز کا نوسٹیلجیا، بچپن کی گلیاں، اسکول کا آنگن، چھت پر لہراتا ہوا سبز ہلالی پرچم، عید کی رونقیں اور شام کی اذان کی صدا جو دل کو سکون بخشتی تھی۔ پردیس میں رہ کر وہ ہر لمحہ اپنے وطن کی خوشبو محسوس کرتی ہیں جیسے اُن کا دل ابھی تک مٹی کے لمس، زبان کے ذائقے اور رسم و رواج کے رنگوں میں الجھا ہوا ہے۔ ان کے اندر ایک نہ ختم ہونے والی تڑپ ہے، جو نہ صرف ذاتی یادوں سے جڑی ہے بلکہ قومی شعور سے بھی۔ اُن کی باتوں میں صرف محبت نہیں بلکہ ایک فکری گہرائی بھی ہے۔ وطن کی

حالتِ زار پر دکھ، نوجوان نسل کی بے خبری پر فکر۔ ماہ پارہ صرف یادِ وطن میں نہیں جیتی بلکہ وہ ایک باشعور آواز ہے جو پردیس میں بیٹھ کر بھی اپنی مٹی سے جڑے ہر مسئلے کو نہ صرف محسوس کرتی ہیں بلکہ اس کا اظہار بھی کرتی ہیں۔

پاکستان میں بنیادی سہولیات کا فقدان ایک ایسا المیہ ہے جس نے کروڑوں لوگوں کی زندگیاں مشکلات کے اندھیروں میں دھکیل دی ہیں۔ صاف پانی، صحت، تعلیم، روزگار، اور محفوظ رہائش جیسی بنیادی ضروریات ہر انسان کا بنیادی حق ہیں، لیکن افسوس کہ ہمارے وطن کے بیشتر حصے ان سے محروم ہیں۔ کسی ماں کی آنکھوں میں اپنے بیمار بچے کے لیے دوانہ ہونے کی بے بسی، کسی باپ کا روزگار کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانا یا کسی طالب علم کا کتابوں اور قلم کے بغیر خواب دیکھنا، یہ سب کربناک تصویریں ہیں۔ ان سہولتوں کے بغیر زندگی ایک مسلسل اذیت بن جاتی ہے۔ اندھیروں میں ڈوبے ہوئے گھر، بجھے ہوئے چولہے، اور سردی یا گرمی کی شدت سے تڑپتے لوگ، یہ سب مناظر دل کو رلا دیتے ہیں۔ اگر پاکستان کا موازنہ دوسرے ممالک سے کیا جائے تو بجلی اور گیس جیسی بنیادی سہولیات شہریوں کو میسر نہیں، بغیر مطلع کیے پورا پورا دن بجلی اور گیس نہیں آتی۔ مصنفہ بھی اپنی آپ بیتی میں اس بات کا ذکر کرتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

> "اپنے بچوں کے لیے خصوصی اجازت لے کر ایک خاتون کو ساتھ لائی تھی۔
> کوئی چند ماہ بعد ایک دن وہ بڑی حیرانی سے مجھ سے پوچھنے لگی کہ کیا یہاں
> کبھی بجلی نہیں جاتی؟ یہ تو خیر چند ماہ بعد کی بات تھی مگر مجھے تو تیس برس
> میں ایسا کوئی دن یاد نہیں جب بجلی یا گیس گئی ہو۔ البتہ مرمت اور دیکھ
> بھال کے لیے بجلی یا گیس چند گھنٹوں کے لیے جب بند کی جاتی ہے تو اُس
> علاقے کے مکینوں کو پہلے سے مطلع کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بجلی
> اور گیس کی جو حالت زار ہے، اُس پر کچھ کہنے کے لیے الفاظ کہاں سے
> لیں اور کیا کہا جائے"۔(۵)

وہ ماضی کے ان واقعات کو بھی دہراتی ہیں جو پاکستان کی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جو نقصان پاکستان کو ہوا۔ اس کا ذمے دار وہ قیادت کرنے والوں کو ٹھہراتی ہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتی ہیں:

> "پاکستان کی تاریخ کا یہ ایک ایسا المیہ تھا جس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا تھا مگر
> تاریخ کا اس سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ قیادت کرنے والوں کا کیونکہ
> کوئی ذاتی نقصان نہیں ہوتا، اس لیے وہ ایسے غلطیاں بار بار کرتے ہیں
> اور پاکستان کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے۔
>
> وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
>
> کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا
>
> کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو آج پاکستان ایک مختلف ملک ہوتا۔"(۶)

پاکستان میں طبقاتی کشمکش ایک تلخ حقیقت ہے جس کی وجہ سے معاشرتی توازن متاثر ہو رہا ہے۔ ایک طرف عالیشان محلات، چمچماتی گاڑیاں، اور مہنگی تقریبات ہیں، تو دوسری طرف فٹ پاتھ پر سوتے، خالی پیٹ، پیاسے اور امید سے محروم انسان۔ یہ تضاد صرف معاشی نہیں، بلکہ اخلاقی، سماجی، اور روحانی سطح پر بھی ہماری شکست کی علامت ہے۔ غریب طبقہ دن رات محنت کرتا ہے لیکن پھر بھی دو وقت کی روٹی اور بچوں کی تعلیم جیسی بنیادی ضرورتوں کے لیے ترستا رہتا ہے جبکہ امیر طبقے کے لیے زندگی ایک نہ ختم ہونے والا جشن ہے۔ یہ فرق صرف دولت کا نہیں، مواقع، انصاف، اور عزتِ نفس کا بھی ہے۔ یہ کشمکش معاشرت میں نفرت، حسد، اور مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ نوجوانوں کے خواب دفن ہو جاتے ہیں، صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں اور معاشرہ ترقی کی بجائے زوال کی طرف بڑھتا ہے۔

ماہ پارہ نے آپ بیتی میں ۱۹۹۲ء کے ایک سادہ مگر معنی خیز واقعے کو بیان کیا ہے جب ایک مقامی پاکستانی، جو بیرون ملک ایک گروسری اسٹور چلاتا تھا، نے صرف اس لیے اپنی شناخت چھپانے کی التجا کی کہ وہ "پرچون فروش" ہے۔ اس کی یہ التجا کسی جرم یا خوف کی بنیاد پر نہ تھی، بلکہ اُس احساسِ کمتری پر مبنی تھی جو ہمارے مشرقی معاشروں میں پیشہ اور عزت کے درمیان مصنوعی تعلق کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عزت صرف وکیل، ڈاکٹر، بیوروکریٹ یا صنعتکار ہونے میں سمجھی جاتی ہے، جبکہ محنت کش طبقے چاہے وہ پرچون فروش ہوں، ترکھان ہوں یا ڈرائیور کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ رویہ دراصل جاگیردارانہ ذہنیت کا تسلسل ہے جو آج بھی ہمارے اندر زندہ ہے۔ تعلیم، اخلاق، یا محنت کی بنیاد پر عزت دینے کے بجائے ہم صرف معاشی حیثیت یا عہدے کو عزت کا معیار مانتے ہیں۔ اسی لیے دیارِ غیر میں بھی جہاں کام کرنے والے کی قدر کی جاتی ہے، ہمارے لوگ اپنے ہی ہم وطنوں کے درمیان اپنے کام کو چھپانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ محض ایک فرد کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری قوم کی نفسیاتی غلامی کا عکاس ہے۔ یہ مشاہدہ دراصل سماجی شعور کی پکار ہے، یہ دعوتِ فکر ہے کہ ہم اپنے اندر چھپے طبقاتی تعصب کو پہچانیں اور اس سوچ کو بدلیں جو انسان کی عزت کو اس کے کام کی وجہ سے کرتی ہے۔ آخر کار پرچون فروش بھی تو وہی ہے جو ہماری بنیادی ضرورتیں پوری کرتا ہے مگر ہم اسے اپنی دعوتوں میں "ظاہر" کرنے کے لائق نہیں سمجھتے۔ ماہ پارہ لکھتی ہیں:

> "وہ صاحب میرے قریب آئے اور بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے کہا، یہاں کسی کو نہ بتائیے گا کہ میری پرچون کی دکان ہے۔ مگر کیوں، میں نے سوچا، خیر میں نے ان سے تو کچھ نہیں کہا۔ مگر دکھ ہوا کہ یہ وہ احساس کمتری ہے جو ہمارے سماج کی جڑوں میں سرایت کر چکا ہے۔ یہ ہے وہ سوچ جس میں انسان کی عزت نہیں، کام کرنے والے کی عزت نہیں۔ صرف اعلیٰ عہدوں، چند پروفیشنز اور صاحب ثروت افراد کی عزت ہوتی ہے۔ ایسے طبقاتی امتیازات نے سماج کا چہرہ مسخ کر رکھا ہے۔"(۷)

بلاشبہ آج بھی دورِ جاہلیت کی وہی رسمیں اہم ہیں جہاں صرف مراعات یافتہ طبقے کے لوگ داخل ہو سکتے ہیں۔ گویا ہم نے جدید لباس پہن لیا مگر پرانے زنگ آلود خیالات کو سینے سے لگائے رکھا۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ برطانیہ میں طبقاتی فرق کم کرنے کی کوشش کی گئی، جب کہ پاکستان میں طبقاتی خلیج ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید گہری ہوتی جا رہی ہے۔ وہاں مزدور کی عزت کی جاتی ہے، یہاں مزدور کو صرف ایک "وسیلہ" سمجھا جاتا ہے افسوس کہ ہم نے محنت کرنے والے ہاتھوں کی عزت کرنا چھوڑ دیا ہے، بلکہ الٹا ان کے ساتھ جڑا ہونا باعثِ شرمندگی سمجھا جانے لگا ہے۔ جس معاشرے میں مزدور ہونا، یا مزدور کے ساتھ رشتہ یا تعلق رکھنا باعثِ شرمندگی سمجھا جائے، وہاں انسانیت کی قدریں مر چکی ہوتی ہیں۔ اس شرمندگی کی جڑیں ہمارے فرسودہ طبقاتی نظام اور دکھاوے پر مبنی سوچ میں پیوست ہیں، جہاں سفید پوشی اور مصنوعی شرافت کو عزت کا معیار بنالیا گیا ہے، اور محنت کو کم تر سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہی مزدوروں کے ہاتھوں کی محنت سے ہماری عمارتیں کھڑی ہیں، کھیتوں میں فصلیں لہراتی ہیں اور شہروں کی رونق برقرار ہے۔ اگر ہم مزدوروں کے ساتھ تعلق پر شرمندہ ہیں تو دراصل ہم اپنے ضمیر اور اپنی انسانیت سے غداری کر رہے ہیں۔ برطانیہ میں مزدور طبقے کے ساتھ میل جول کو باعث شرمندگی نہیں سمجھا جاتا۔ مصنفہ کو اس نظام نے بہت متاثر کیا ہے۔ اسی بات کی نشاندہی وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> "چند دن قبل کی بات ہے میں نے دیکھا کہ ہمارے گھر میں کھڑکیاں صاف کرنے والے ونڈو کلینز لڑکے نے شام چار بجے تک ہمارے اور اطراف میں کچھ دوسرے گھروں کی کھڑکیاں صاف کیں۔ اپنا کام ختم کر کے گاڑی میں رکھے اپنے کپڑے بدل کر اُسی کافی ہاؤس میں بیٹھا کافی پی رہا تھا جہاں ہم سب لوگ قریب قریب بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ کسی کی سماجی حیثیت میں کچھ فرق نظر نہیں آرہا تھا"۔ (۸)

پاکستانی حکمران صرف شہرت اور پوری دنیا میں اپنا بول بالا چاہتے ہیں۔ انھیں عوام کی مشکلات سے ووٹ کے علاوہ کوئی سروکار نہیں۔ ان کے نزدیک عوام کا درد صرف انتخابی نعروں کا حصہ ہے، حقیقت میں نہیں۔ ان کی محفلوں کی چمک دمک، قافلوں کی لمبی قطاریں اور شاہانہ پروٹوکول اس بات کا ثبوت ہیں کہ انھیں بس اپنی طاقت، اپنی دولت اور اپنے اقتدار کی فکر ہے۔ پاکستانی حکمرانوں کی بے حسّی اس قدر سنگدلانہ ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے ان کے دلوں میں عوام کے لیے کوئی درد باقی ہی نہیں رہا۔ اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھے ان لوگوں کے لیے عوام صرف ووٹ کی گنتی، جلوس کی بھیڑ، یا جلسوں کی تالیاں ہیں۔ ان کی آنکھوں میں بھوک، ان کے چہروں پر پھیلی مایوسی اور ان کی جھکی ہوئی کمر کا بوجھ، کسی بھی حکمران کے ضمیر کو نہیں جھنجھوڑتا۔ بقول جاوید ہاشمی:

> "وقت کے خدا اس کے جسم اور روح پہ قابض ہیں۔ تعلیم، قانون اور انصاف کے دروازے اس پر بند ہیں"۔ (۹)

بجلی، پانی، گیس، صحت، تعلیم بنیادی سہولتیں آج بھی ایک خواب بنی ہوئی ہیں اور حکمران اپنے محلوں میں بیٹھ کر لمبی تقاریر اور جھوٹے وعدے کر کے خود کو عوام کا خیر خواہ ظاہر کرتے ہیں۔ عوام سڑکوں پر رل رہے ہیں، بچے فاقوں کی آگ میں جل رہے ہیں، نوجوان بے روزگاری کے عذاب میں خودکشی پر مجبور ہیں مگر حکمرانوں کے ایجنڈے میں کہیں بھی عوام کا درد شامل نہیں جبکہ اسلامی ریاست کا بنیادی اصول یہ تھا کہ حکمران عوام کے اوپر حکومت کرنے کے بجائے ان کی خدمت کرنے کے پابند ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"قوم کا سردار وہ ہے جو ان کا خادم ہو۔"(۱۰)

حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، اور حضرت علیؓ چاروں خلفائے راشدین نے خلافت کو اقتدار یا جاہ و جلال کی کرسی نہیں سمجھا بلکہ عوام کی ذمہ داری اور اللہ کی امانت سمجھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ جب خلیفہ بنے، تو فرمایا:

"مجھے تمھارا سربراہ بنایا گیا ہے۔ میں خود کو تم سے بہتر نہیں سمجھتا۔ اگر میں درست کام کروں تو میری مدد کرنا۔ اگر مجھ سے غلطی ہو جائے تو میری اصلاح کرنا"۔(۱۱)

اصحابِ رسول ﷺ کا طرزِ حکمرانی دراصل خدمتِ خلق کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ وہ اقتدار کو دولت یا شان و شوکت کے لیے نہیں، بلکہ لوگوں کی خدمت اور انصاف کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریے پر رکھی گئی لیکن اسلامی نظریات کو برطانیہ کے حکمرانوں نے اپنا شعار بنالیا۔ مصنفہ وہاں کے حکمرانوں کی انکساری اور عاجزی سے بہت متاثر ہوئیں اور ان کی اخلاقیات کا آنکھوں دیکھا حال "میرا زمانہ میری کہانی" میں یوں بیان کرتی ہیں:

"بہت برسوں پہلے کی بات ہے ہمارے محلے کے پارک میں گرمیوں میں ایک چھوٹا سا میلہ سا لگا کرتا تھا جیسے ہمارے ہاں کالجوں میں مینا بازار لگا کرتے تھے۔ اس میں علاقے کے لوگ چھوٹے چھوٹے سٹالز لگاتے ہیں۔ کچھ بزرگ عورتیں اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی اون کی یا کپڑے کی تیزیں جیسے کشن وغیرہ فروخت کرتی تھیں۔ میں نے دیکھا اُس علاقے کے ممبر پارلیمان سب سے ملتے ہوئے، خود اپنا تعارف کرواتے ہوئے پھر رہے تھے۔ لوگ اُن کی طرف صرف اُسی وقت متوجہ ہوتے تھے جب وہ کھڑے ہو کر سب کا حال چال پوچھ رہے ہوتے تھے۔ وطن عزیز میں گارڈز کے جلو میں چلنے والے ارکانِ اسمبلی کے پاس دُنیا کی ہر نعمت ہوتی ہے، بس اپنے علاقے میں جانے اور عام لوگوں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا"۔(۱۲)

پاکستان میں شرح خواندگی ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جو قوم کی ترقی کی راہ میں ایک سنگین رکاوٹ بن چکی ہے۔ آج جب دنیا تعلیم کے سہارے خلا کی وسعتوں کو تسخیر کر رہی ہے، ہمارا ملک اب بھی بنیادی تعلیمی سہولیات کی کمی کا شکار ہے۔ لاکھوں بچے ایسے ہیں جو اسکول کی دہلیز تک پہنچنے سے محروم ہیں اور دیہی علاقوں میں یہ مسئلہ اور بھی سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کو اکثر غیر ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ انھیں چھوٹی عمر سے ہی گھر کے کاموں اور ذمہ داریوں میں الجھا دیا جاتا ہے۔ حکومتی اعداد و شمار اگرچہ شرح خواندگی کو تقریباً ۶۰ فیصد کے قریب بتاتے ہیں مگر زمینی حقیقت اس سے کہیں زیادہ مایوس کن ہے۔ خاص طور پر دیہات، خواتین اور نچلے طبقے میں یہ شرح انتہائی کم ہے۔ بہت سے بچے یا تو غربت کے باعث تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں یا پھر کم عمری میں محنت مزدوری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب تک تعلیم کو بنیادی حق تسلیم کرتے ہوئے ہر طبقے تک پہنچانے کی عملی کوشش نہیں کی جاتی، ملک کی ترقی کا خواب ادھورا ہی رہے گا۔

تعلیم صرف ایک کتاب یا قلم کا نام نہیں بلکہ یہ شعور، خود اعتمادی اور معاشرتی تبدیلی کی بنیاد ہے۔ افسوس کہ ہمارے ملک میں تعلیم کو ایک بنیادی حق کی بجائے ایک مراعات یافتہ طبقے کی سہولت سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے بغیر قومیں صرف جسمانی طور پر زندہ رہ سکتی ہیں، فکری اور روحانی طور پر نہیں۔ حکمرانوں کی عدم توجہی، ناقص تعلیمی پالیسیاں، بدعنوانی اور فنڈز کی غلط تقسیم نے اس خواب کو مزید دور کر دیا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان ترقی کرے تو ہمیں تعلیم کو پہلی ترجیح بنانا ہو گا۔ اسکولوں کی حالت بہتر کرنی ہو گی، اساتذہ کی تربیت اور عزت بحال کرنی ہو گی اور ہر بچے کو کتاب اور قلم کی طاقت دینا ہو گی۔ کیونکہ روشنی کے بغیر اندھیرا چھٹ نہیں سکتا اور تعلیم کے بغیر قوم کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ یہی واحد راستہ ہے جو پاکستان کو ترقی، خوشحالی اور عزت کی منزل تک لے جا سکتا ہے۔

مصنفہ کا خیال ہے کہ عالمی سطح پر پاکستانی درس گاہیں امریکہ، برطانیہ، جرمنی، آسٹریلیا، اٹلی، ہالینڈ، سویڈن، چین کی درسگاہوں کی ہم پلہ نہیں ہیں۔ وہ آپ بیتی میں پاکستان کی تعلیم کا موازنہ ترقی یافتہ ممالک سے کرتی ہیں اور باقاعدہ درجہ بندی کر کے قاری پر عیاں کرتی ہیں کہ پاکستان کی دانش گاہیں کس سطح پر ہیں۔ اس امر کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتی ہیں:

> ''دُنیا کی چار سو بہترین یونیورسٹیوں سے تین سو ساٹھ دنیا کے ترقی یافتہ ترین ملکوں میں ہیں۔ جدید علوم سے لیس ان یونیورسٹیوں میں ۱۰۸ امریکا میں، ۴۸ برطانیہ میں، ۳۹ جرمنی میں، ۲۴ آسٹریلیا میں، ۱۶ کینیڈا میں، ۱۱ اٹلی میں، ت ۱۳ ہالینڈ میں، ۱۰ سویڈن میں، ۱۰ چین میں، جن میں سے ۴ ہانگ کانگ میں ہیں۔ فرانس کی ۱۴، تائیوان کی ۱، آٹھ آٹھ سوئزرلینڈ اور جنوبی کوریا میں، ۶ جاپان میں ہیں۔ ایران کی ایک دانشگاہ بھی ان چار سو درسگاہوں میں شامل ہے۔ یورپ کے چند کروڑ آبادی

والے ملکوں میں بہترین درسگاہیں ہیں مگر دُنیا کی چھٹی بڑی آبادی والے
ملک پاکستان میں کوئی ایسی دانشگاہ نہیں جو عالمی معیار پر پوری اترتی ہو۔
اگر اس درجہ بندی میں کوئی تعصّب ہوتا تو اس میں چین اور ایران کی
یونیورسٹی شامل نہ ہوتی۔''(۱۳)

متوسط طبقے کے والدین بچوں کے اخراجات کے بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک جاتے ہیں، اُن کے بچے جب کسی نہ کسی طرح پڑھ جاتے ہیں تو اعلیٰ تعلیم کے لیے اور بہتر مستقبل کی تلاش میں غیر ملکی تعلیمی اداروں کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں جبکہ امراء اور صاحب اقتدار کے بچوں کی زندگیاں آسان ہوتی ہیں، انھیں ملازمت کی کوئی فکر نہیں صرف یہ طبقہ پاکستان میں کامیاب اور بھرپور زندگی گزار سکتا ہے۔ اس بات کا اقرار مصنفہ اپنی زبانی کرتی ہیں۔ لکھتی ہیں:

''جو بیرون ملک کسی معروف یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب
ہو جاتے ہیں تو وہ تعلیم کے بعد اُنہی ملکوں میں روزگار کی تلاش میں
سرگرداں سرگرداں نظر آتے ہیں، واپس جانے پر کسی اچھی ملازمت
کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اُن کے والدین بھی اپنے دل پر
پتھر رکھ کر یہی چاہتے ہیں کہ بچے باہر ہی اچھی کمائی پر لگ جائیں۔ البتہ
صاحب ثروت اور با اختیار لوگوں کے بچے واپس جاتے ہیں جن کے
والدین، عزیز واقربا اقتدار کے ایوانوں میں ہوتے ہیں اور بڑے بڑے
کاروبار کے مالک ہیں۔ صاحب ثروت اور با رسوخ افراد اپنے بچوں کو
جائز ناجائز طریقے سے کامیاب کروانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار
ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی دوڑ تھی جس میں اچھی اخلاقی روایات کے
حامل بچوں کا پیچھے رہ جانا دیوار پر لکھا نظر آ رہا ہوتا ہے۔''(۱۴)

مارشل لا ایک ایسا نظام ہے جس میں شہری حکومت کی جگہ عسکری حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ اس وقت نافذ کیا جاتا ہے جب شہری حکومت کسی ملک میں امن و امان برقرار رکھنے میں ناکام ہو جائے یا کسی ہنگامی صورتحال کا سامنا ہو۔ اس دوران فوج ملک کا انتظام سنبھال لیتی ہے اور عام شہری قوانین کی جگہ فوجی قوانین نافذ ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی پاکستانی سے پوچھا جائے کہ مارشل لا کیا ہوتا ہے؟ وہ فوراً بتائے گا کہ فوج جب کسی ملک کا اقتدار سنبھال لیتی ہے تو اسے مارشل لا کہا جاتا ہے۔ جمہوریت میں سیاست دان ریاستی امور کے نگہبان و منتظم ہوتے ہیں۔ مارشل لا میں فوج۔ جمہوریت میں وزیر اعظم سربراہِ حکومت ہوتا ہے، مارشل لا میں چیف آف آرمی سٹاف۔ اس منصب کو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کہا جاتا ہے۔

پاکستان میں کل چار مارشل لا لگائے گئے ہیں۔ پہلا مارشل لا ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اسکندر مرزا نے لگایا تھا۔ اس کے بعد جنرل ایوب خان نے اسکندر مرزا کو ہٹا کر خود چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے تھے۔ دوسرا مارشل لا جنرل یحییٰ خان نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو لگایا۔ تیسرا مارشل لا جنرل ضیا الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو لگایا۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کا تختہ الٹ کر پاکستان میں چوتھا مارشل لا لگا دیا تھا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے مطابق:

> "پاکستان اپنے قیام سے لے کر بیسویں صدی کے اختتام تک سیاسی طور پر ہر قسم کے تجربات کا شکار رہا۔ تین آئین بنے لیکن یکے بعد دیگرے فوجی حکمرانوں نے انھیں ختم کر دیا۔ ۲۰۰۰ء تک تقریباً آدھا وقت آرمی کی حکومت رہی جس نے جمہوری اداروں کو جڑ نہ پکڑنے دی۔"(۱۵)

پاکستان میں نوے کے عشرے میں حکومتیں میوزیکل چیئرز کی طرح بدلی جا رہی تھی۔ عوامی مسائل حل ہونے کے بجائے اُن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ چوتھا مارشل لا ماہ پارہ کے واپس نہ آنے کی سب سے بڑی وجہ بنا۔ وہ خود کہتی ہیں:

> "۱۹۹۹ء میں چوتھی مرتبہ مارشل لا نے جیسے ہمارے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ وہ ملک جہاں سیاسی استحکام نہ ہو وہاں عوامی بھلائی کے منصوبے نہیں بلکہ دوسرے کی حکومت گرانے، ٹانگ کھینچنے، خود اقتدار میں آنے، اپنا اقتدار بچانے اور طول دینے کی حکمت عملی بنتی ہے۔"(۱۶)

آپ بیتی میں جب بلوچستان کا ذکر آتا ہے تو مصنفہ کی گفتگو میں ایک گہری فکرمندی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بلوچستان کو محض ایک صوبہ نہیں بلکہ پاکستان کے دل کا وہ گوشہ سمجھتی ہیں جس کی دھڑکنیں برسوں سے نظر انداز کی جا رہی ہیں۔ بلوچستان کے عوام کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے اُن کی تکالیف کو یا تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر ان پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ بلوچستان کا مسئلہ صرف وسائل کی تقسیم یا ترقیاتی کاموں کی کمی کا نہیں، بلکہ ایک جذباتی فاصلے، عدم مساوات اور ریاستی بے حسّی کا مسئلہ ہے۔ اگر نوجوانوں کے ہاتھوں میں کتاب اور ان کی آنکھوں میں خواب ہوں تو ان کے قدم ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ جب تک ہم بلوچستان کو دل سے اپنا نہیں مانیں گے، محض نعروں اور پالیسیوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ بلوچستان کی مٹی میں جنم لینے والے بھی خود کو اتنا ہی پاکستانی محسوس کریں جتنا لاہور یا کراچی میں رہنے والا کرتا ہے۔ مصنفہ اس جانب توجہ دلاتی ہیں کہ اگر ایک بھی خطہ پیچھے رہ جائے، تو ترقی کا کوئی خواب مکمل نہیں ہو سکتا۔

بلوچستان لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے سنگین مسائل کا شکار ہے۔ یہاں نہ صرف تعلیمی اداروں کی شدید کمی ہے بلکہ ثقافتی رکاوٹیں، غربت، قبائلی نظام اور حکومتی عدم توجہ نے بچیوں کی تعلیم کو ایک چیلنج بنا دیا ہے۔ بیشتر دیہی علاقوں میں لڑکیوں کے لیے علیحدہ اسکول موجود نہیں اور اگر کہیں اسکول موجود بھی ہو تو وہاں بنیادی سہولیات، خواتین اساتذہ اور سکیورٹی کا فقدان ہوتا ہے۔ اگر حکومتی ادارے، سماجی تنظیمیں اور مخیر حضرات سنجیدگی سے لڑکیوں کی تعلیم کو ترجیح دیں

تو بلوچستان کی بیٹیاں بھی ملک کی ترقی میں فعال کردار ادا کر سکتی ہیں۔ تعلیم صرف لڑکیوں کا حق نہیں بلکہ ایک باشعور معاشرے کی بنیاد بھی ہے۔ماہ پارہ جب تعلیم سے محروم بچیوں سے ملیں تو ان کی روداد سن کر انھیں سخت تکلیف ہوئی۔اس المیہ کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

> "اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، ایک بچی بولی! آنٹی ہم پڑھنا چاہتے ہیں مگر ہمارے لوگ ہمیں پانچ کلاس سے آگے نہیں پڑھاتے۔ان بچیوں کے لہجے میں چھپی تڑپ میں محسوس کر سکتی تھی۔"(۱۷)

مغرب کے تیز رفتار، مصروف اور انفرادی زندگی کے ہجوم میں جب کسی گھر سے دادا جی کی ہلکی کھانسی، دادی اماں کی دعاؤں کی صدائیں، اور ماں باپ کی نرم آوازیں سنائی دیں تو یقین جانیں وہ گھر صرف اینٹ پتھر کا نہیں رہتا، وہ محبت، دعاؤں اور برکتوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ایسے معاشرے میں جہاں اٹھارہ برس کی عمر کو آزادی کی حد مانا جاتا ہے، وہاں اگر کوئی اپنی آزادی کو اپنوں کی قربت پر قربان کر دے تو وہ صرف ایک فیصلہ نہیں، ایک فخر ہے، ایک ورثہ ہے جسے اگلی نسلوں تک منتقل کیا جارہا ہے۔مغرب میں رہتے ہوئے اپنے والدین اور دادا، دادی کے ساتھ رہنا ایک نایاب بات ہے۔نہ صرف اس لیے کہ یہ مشکل ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہ روح کو تازگی دیتا ہے۔یہ وہ ساتھ ہے جہاں ہر صبح دادی کی تسبیح کی آواز دل کو سکون دیتی ہے، دادا کے قصے بچوں کی شخصیت سنوارتے ہیں، ماں کی شفقت اور باپ کا سایہ ہر گھڑی حوصلہ دیتے ہیں۔

یہ روایت محض رہائش کا انتظام نہیں بلکہ تعلق، توقیر اور تربیت کی مکمل درسگاہ ہے۔جو بچے دادا، دادی کی گود میں کھیلتے ہیں، وہ دنیا کی گود میں گرنے سے بچ جاتے ہیں۔

اس جدید دنیا میں اگر کوئی اپنے بزرگوں کو ساتھ رکھے تو گویا وہ وقت کو تھامے بیٹھا ہے۔اس نے وقت کی تیز آندھیوں میں مشرق کی خوشبو کو زندہ رکھا ہے۔ایسے گھروں سے نہ صرف برکت اٹھتی ہے، بلکہ نسلیں سنورتی ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جو دیارِ غیر میں بھی مشرق کے چراغ جلائے رکھتے ہیں۔ماہ پارہ کے بچے بھی ایسے ہی ہیں انھوں نے ان کی تربیت اتنی اعلیٰ کی کہ وہ آج بھی مشرقی روایات سے اپنائے ہوئے ہیں اور اپنے بزرگوں تک سے جڑے ہوئے ہیں۔لکھتی ہیں:

> "صفدر اور میں نے ایک مختلف تہذیب میں اپنے بچوں پر اپنی مشرقی اقدار تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ دونوں تہذیبوں کے مثبت اور منفی پہلو سمجھاتے رہے۔ ہماری بیٹی زہرہ ماشاء اللہ اپنے شوہر ندیم رضا زیدی اور بچوں عباس حسنین اور زینا کے ہمراہ اپنے گھر میں خوش اور ہم سے چند میل دور ہی رہائش پذیر ہے۔ دونوں اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت میں مصروف ہیں۔ اُن کا بڑا بیٹا عاس ماشاء اللہ صرف دس برس کی عمر

میں اتنی کتابیں پڑھ چکا ہے، جو یونیورسٹی لیول کے بچے بھی نہیں پڑھتے۔ اُسے لٹل سکالر کہنا غلط نہیں ہو گا۔ ندیم لندن میں پیدا ہونے کے باوجود مشرقی اقدار کو دل سے لگائے رشتوں اور خاندان کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ ہم اُس علاقے سے جہاں پچیس برس سے مقیم تھے، ندیم اور زہرہ کی خواہش پر ہی اُن کے گھر کے قریب منتقل ہو گئے۔ اُن کے بچے اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ وہ ماشاء اللہ سے ددھیال اور ننھیال کے سب رشتوں کے درمیان پرورش پا رہے ہیں۔"(۱۸)

دیارِ غیر میں اتنا عرصہ گزارنے کے باوجود اپنی زمین اور اپنے لوگوں سے ماہ پارہ کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹے۔ اب بھی پہلے کی طرح مضبوط ہیں۔ فاصلوں اور گزرتے موسموں سے ان رشتوں کی شدت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ بچے بھی ہر سال چھٹیوں میں پاکستان جاتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پلنے بڑھنے اور پڑھنے کے باوجود اُس دھرتی سے اُن کے رشتہ نہیں ٹوٹے۔ ماہ پارہ صفدر کی راہ میں جو رکاوٹیں آئیں، وہ صرف حالات کی کٹھنائیاں نہ تھیں بلکہ وہ ایک ایسی اذیت ناک کشمکش تھی جس نے ان کے دل کو ہمیشہ دو حصوں میں بانٹے رکھا۔ ایک طرف وطن کی مٹی کی خوشبو، دوسری طرف بچوں کا مستقبل جہاں ان کے بچے پل کر بڑے ہوئے۔ ان کی چاہت، ان کی تمنا ہمیشہ یہ رہی کہ وہ اپنی مٹی میں سانس لیں مگر نظام کی ناہمواری، تعلیم کا زوال، حکمرانوں کی بے حسّی، فرقہ واریت، خونریزی، اور بنیادی سہولیات کی عدم دستیابی نے انھیں پلٹنے نہ دیا۔ وہ جانتی ہیں کہ پاکستان صرف جغرافیہ کا کوئی کونا نہیں بلکہ ان کے بزرگوں کے لہو سے سینچی گئی وہ سرزمین ہے جس پر ان کے خوابوں کی بنیاد رکھی گئی۔ یہی سرزمین ان کے لیے امید کا چراغ، دعا کی پہلی و آخری منزل اور پہچان کا حوالہ ہے۔

تین دہائیوں سے زائد وقت برطانیہ میں گزارنے کے باوجود ان کے دل کی دھڑکن اب بھی لاہور کی سحر انگیز صبحوں، سرگودھا کی شاموں اور خوشاب کی ہواؤں سے جڑی ہوئی ہے۔ وہاں رہنے کا فیصلہ ان کا اپنا تھا مگر آج بھی وطنِ عزیز کی یاد ان کے دل میں زندہ ہے۔ جب برطانیہ کی سرد ہواؤں میں مشرق کی گرم خوشبو انھیں چھو کر گزرتی ہے تو ان کے دل میں ایک ایسا سنّاٹا اتر تا ہے جو صرف وہی محسوس کر سکتی ہیں۔ ایک ایسا خلا جو ہجوم میں بھی تنہا کر دے۔ وہ مانتی ہیں کہ انسان جہاں بھی چلا جائے، دل کی جڑیں اپنے وطن کی مٹی سے بندھی رہتی ہیں۔

حوالہ جات

1۔ ماہ پارہ صفدر، میرا زمانہ میری کہانی، جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۲ء۔ بیک فلیپ

2۔ ایضاً، ص:۲۸۵

3۔ ایضاً، ص:۴۲۶

4۔ ایضاً، ص:۴۲۶۔۴۲۷

5۔ ایضاً، ص:۴۲۷

6۔ ایضاً، ص:۶۵

7۔ یضاً، ص:۲۸۴

8۔ ایضاً، ص:۴۳۰

9۔ جاوید ہاشمی۔ ہاں میں باغی ہوں۔ لاہور: ساگر پبلشرز، ۲۰۰۵ء۔ ص:۴

10۔ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفة حدیث نمبر ۴۰۲۴، پرنسپلیز آف گورنمنٹ، تاریخ انبیاء و پیغمبر وال، ص:۲۴۴

11۔ اقبال رنگونی، محمد، مولانا۔ سیرت سیدنا ابو بکر الصدیق ؓ۔ لاہور: ادارہ اشاعت الاسلام، ۱۹۹۰ء۔ ص:۴۴۳

12۔ ماہ پارہ صفدر۔ میرا زمانہ میری کہانی۔ ص:۴۲۸

13۔ ایضاً، ص:۴۲۹

14۔ ایضاً، ص:۴۳۰

15۔ خواجہ محمد زکریا، (مدیر عمومی) اردو ادب (آغاز تا بیسویں صدی) مختصر تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۴ء۔ ص:۱۲

16۔ ماہ پارہ صفدر۔ میرا زمانہ میری کہانی۔ ص:۴۳۱

17۔ ایضاً، ص:۳۲۰

18۔ ایضاً، ص:431

References:

1. Mah Para Safdar, Mera Zamana Meri Kahani, Jhelum: Book Corner, 2022, Back Flap.
2. Ibid., p. 285
3. Ibid., p. 426
4. Ibid., pp. 426–427
5. Ibid., p. 427
6. Ibid., p. 65
7. Ibid., p. 284
8. Ibid., p. 430
9. Javed Hashmi, Haan Main Baghi Hoon, Lahore: Sagar Publishers, 2005, p. 4
10. Sahih Bukhari, Kitab al-Maghazi, Bab Wafd Bani Hanifa, Hadith No. 4024; Principles of Government, Tareekh Anbiya wa Paighambarwal, p. 244
11. Iqbal Rangooni, Maulana Muhammad, Seerat Syedna Abu Bakr al-Siddiq (RA), Lahore: Idarah Ishaat-ul-Islam, 1990, p. 443
12. Mah Para Safdar, Mera Zamana Meri Kahani, p. 428
13. Ibid., p. 429
14. Ibid., p. 430
15. Khawaja Muhammad Zakariya (Ed.), Urdu Adab (Aaghaz ta Beeswin Sadi): Mukhtasir Tareekh Adabiyat Musalmanan Pakistan-o-Hind, Lahore: Punjab University, 2014, p. 12
16. Mah Para Safdar, Mera Zamana Meri Kahani, p. 431
17. Ibid., p. 320
18. Ibid., p. 431